شمس الرحمٰن فاروقی

ذکرِ داستان گویاں

اس کتاب میں جگہ جگہ ہم اس بات کا رونا رو چکے ہیں کہ ہمیں داستان امیر حمزہ کے داستان گویوں، بلکہ یوں کہیں کہ عمومی طور پر کسی بھی داستان گو کے بارے میں، معلومات بہت کم ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش و وفات، ان کی تعلیم و تربیت، تاہل و اولاد، ان سب باتوں کے بارے میں ہمارا علم بہت کم ہے۔ اور مزید افسوس یہ کہ ان معاملات کا جو علم ہم رکھتے بھی ہیں، وہ اکثر غلط، یا بڑی حد تک نامعتبر ہے۔ بہر حال، جو کچھ بھی معلوم ہے اس کا بیان اور حتی الامکان تنقیدی محاکمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

محمد حسین جاہ (وفات، غالباً ۱۸۹۹ء)

یہ کہا جا سکتا ہے کہ داستان امیر حمزہ کی مشہور ترین داستان ''طلسم ہوش ربا'' ہے، اور ''طلسم ہوش ربا'' کی بہترین جلدیں وہ چار جلدیں ہیں جو محمد حسین جاہ نے لکھیں۔ انہوں نے نول کشور پریس کو چھوڑنے کے بعد ''طلسم ہوش ربا'' کی ایک پانچویں جلد بھی لکھی اور وہ بقول خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی، گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور کی شاخ لکھنؤ نے ''جلد پنجم، حصۂ اوّل'' کے نام سے دسمبر ۱۸۹۰ء میں شائع کی۔ لیکن اسے کچھ خاص شہرت نہ حاصل ہوئی۔ اور محمد حسین جاہ کے بارے میں یہی آخری اطلاع ہے لیکن اس پر پورا اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جاہ کی یہ جلد پنجم بہت مختصر (صرف ۲۴۰ صفحے) ہے، اور یہ تقریباً ناپید تھی۔ جناب رفاقت علی شاہد نے اسے پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں دریافت کیا اور اس کی نقل فراہم کی۔ خدابخش لائبریری، بانکی پور پٹنہ نے اسے میری درخواست پر ۲۰۰۰ء میں شائع کر کے عام کر دیا۔

رفاقت علی شاہد نے جاہ کی ''طلسم ہوش ربا'' جلد پنجم کے خدابخش ایڈیشن کے دیباچے میں لکھا ہے کہ ۱۸۹۰ء میں شاخ گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہوری کی کوئی شاخ لکھنؤ میں نہ تھی۔ لکھنؤ میں اس مطبع کی پہلی شاخ بقول رفاقت علی شاہد، ۱۸۹۵ء میں قائم ہوئی۔ لہٰذا یہ بات غیر ممکن ہے

Scanned by CamScanner

کہ جاہ کی جلد پنجم کو گلاب سنگھ نے چھاپا ہو۔ خود اس جلد میں التماس مصنف کے عنوان سے جاہ نے جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ''بعد ترک روزگار ہو جانے کے'' اپنا مطبع قائم کیا ہے۔ خود اس جلد کے حقوق مالکانہ بھی حسینی پریس، لکھنؤ کے نام محفوظ بتائے گئے ہیں۔ لہٰذا یہ ثابت ہے کہ نول کشور پریس چھوڑ کر جاہ نے اپنا کاروبار شروع کیا۔ لیکن ''طلسم ہوش ربا'' جلد پنجم کے بعد کچھ اور شائع نہ ہونے کے معنی یہ نکل سکتے ہیں کہ مطبع کا کاروبار سرسبز نہ ہوا اور جاہ نے اپنے باقی دن داستان گوئی یا بیکاری میں گزارے۔

رفاقت علی شاہد کا خیال ہے کہ ''سید محمد اسمٰعیل'' جن کے اور جاہ کے مشترک اہتمام میں جاہ کی ''طلسم ہوش ربا'' جلد پنجم چھپی تھی، وہی مشہور داستان گو (اسمٰعیل اثر) ہیں جن کی داستان ''صندلی نامہ'' سے ہم واقف ہیں۔ لیکن اس خیال کی کوئی مستحکم دلیل نہیں۔ اسمٰعیل اثر اپنا تخلص ہمیشہ استعمال کرتے تھے اور یہاں تخلص ندارد ہے، صرف ''سید محمد اسمٰعیل'' ہے، لہٰذا ان کا اور سید محمد اسمٰعیل اثر داستان گو کا ایک ہی شخص ہونا قرین قیاس نہیں۔ ممکن ہے یہ صاحب کوئی مالی ساجھے دار رہے ہوں اور جاہ سے ان کا تعلق صرف کاروباری رہا ہو۔

محمد حسین جاہ کی ''طلسم ہوش ربا'' کی جلد چہارم بھی نول کشور پریس نے دسمبر ۱۸۹۰ء میں شائع کی تھی۔ محمد حسین جاہ نے نول کشور پریس کیوں چھوڑا، اس کے بارے میں کوئی مصدقہ معلومات نہیں۔ ایک خیال سا ہے کہ معاوضے کی بات پر کچھ اختلاف رائے تھا اور جاہ نے ناخوش ہو کر نول کشور پریس چھوڑ دیا (بروایت خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی)۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس سے زیادہ بڑی وجہ یہ تھی کہ جاہ بہت سست نویس تھے۔ جلد سوم میں انہوں نے بیماری، بیٹے کی موت، وغیرہ کا ذکر کیا ہے کہ ان وجوہ کی بنا پر انہیں یہ جلد لکھنے میں بڑی مشکل اور تاخیر ہوئی۔ جلد چہارم میں عجلت تحریر کے آثار کہیں کہیں نظر آتے ہیں اور اس کا اختتام بھی کچھ بے ربط سا ہے۔ ممکن ہے جاہ نے ارباب مطبع کے ابرام سے گھبرا کر چوتھی جلد جوں توں لکھ کر جمع کر دی اور مطبع سے تعلق توڑ لیا۔ گلاب سنگھ والی جلد پنجم کے اختصار کا سبب بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سست نویسی کے الزام سے خود کو بری رکھنے کی فکر میں انہوں نے جلد جلد جو ممکن ہوا جمع کر کے اسے

''جلد پنجم، حصۂ اول'' کا نام دے دیا۔ لیکن شاید اس کے بعد وہ کچھ لکھ نہ پائے۔ رفاقت علی شاہد بھی اسی خیال کے ہیں کہ نول کشور پریس اور جاہ میں علیحدگی کی بنا جاہ کی دیر نویسی تھی۔

ایک امکان یہ ہے کہ جاہ اور مطبع کے مراسم بگڑ جانے میں جاہ کے مزاج کو بھی کچھ دخل رہا ہے۔ احمد حسین قمر میں خود بینی بہت تھی، وہ دوسروں (خاص کر جاہ) پر چھینٹے بھی خوب کستے ہیں، اپنی توصیف بھی بے دریغ لکھتے ہیں اور، بے دھڑک ڈینگیں ہانکتے ہیں۔ شیخ تصدق حسین بمشکل ہی کسی کی برائی یا اپنی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں صاحبان ارباب مطبع کی ثناخوانی میں ہمہ وقت رطب اللسان رہتے ہیں۔ محمد حسین جاہ میں خودنگری تو نہیں لیکن خودداری بہت تھی۔ محمد حسین جاہ کسی کی برائی نہیں کرتے، ڈینگیں نہیں مارتے، لیکن عام داستان گویوں کے برخلاف، جاہ نے ارباب مطبع (منشی نول کشور، یا دوسرے اہم اہل کاران) کی ثنا و توصیف بہت کم لکھی ہے۔ اکثر انہوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ اگر منشی نول کشور نے انہیں داستان نویسی پر مامور کیا ہے تو گویا قدردانی ہی کی ہے، کچھ خاص نوال و کرم گستری نہیں کی۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد سوم میں ایک مقام کے سوا (جس کا ذکر آگے آتا ہے) جاہ نے منشی نول کشور یا صاحبان مطبع کی مدح کہیں نہیں لکھی ہے۔ ''طلسم فصاحت'' (اول اشاعت ۱۸۷۴ء) میں البتہ انہوں نے منشی نول کشور کی مدح میں بہت کچھ لکھا ہے، لیکن وہ زمانہ ان کا جوانی کا رہا ہوگا۔ نئی نئی ملازمت تھی لہٰذا حق وفاداری ادا کرنا ہی تھا۔ مگر انہوں نے اس داستان میں مطبع کے دوسرے اہم اہل کاروں کی بھی مدح لکھی ہے، یعنی اشارہ کیا ہے کہ منشی نول کشور کے علاوہ بھی کئی لوگ مستحق تشکر و تمدیح ہیں۔ اور شاید یہ بھی ہے کہ دنیاداری کا بھی تقاضا تھا کہ سردار و سرکار کے علاوہ ملازمین سرکار کو بھی نظر میں رکھا جائے۔ کارکنان مطبع میں سے حسب ذیل حضرات کی توصیف محمد حسین جاہ نے ''طلسم فصاحت'' میں کی ہے: میرزا عاشق علی، نقاش و خوش نویس؛ میر حشمت علی، نقاش؛ شیخ احمد حسین بن شیخ امیر علی، مصور و نقاش؛ مصحح صاحبان (نام نہیں لکھا)؛ محرر صاحبان (نام نہیں لکھا)؛ ایڈیٹر اودھ اخبار (نام نہیں لکھا)؛ لالہ کنول، خزانچی۔

یہ خیال بعید از قیاس نہ ہوگا کہ محمد حسین جاہ اتنے بہت سے کارکنان مطبع کے ستائش

Scanned by CamScanner

گر اس بات سے بھی ہو سکے ہوں گے کہ اس طرح وہ منشی نول کشور کو بالواسطہ یہ اشارہ دینا چاہتے ہوں کہ ان کے رفیع الشان کاروبارِ مملکت کا بلند مرتبہ صرف منشی صاحب ہی کا مرہونِ منت نہیں۔ یہ بات تو ظاہر ہی ہو جاتی ہے کہ جاہ کے مزاج میں ایک طرح کی وارستگی اور خودداری تھی، اور منشی نول کشور سے تعلقات بگڑنے میں اس بات کو بھی کچھ دخل ضرور رہا ہوگا۔ بہرحال، اگر جاہ کی زندگی کی پہلی اہم تاریخ جو ہمیں معلوم ہے، ۱۸۷۴ء ہے (جب ''طلسمِ فصاحت'' نول کشور پریس سے شائع ہوئی) تو دوسری اہم تاریخ جس سے ہم واقف ہیں، ۱۸۹۰ء ہے۔ اس سال ان کی ''طلسم ہوش ربا'' جلد چہارم، نول کشور پریس سے چھپی، اور اسی سال کے دسمبر میں ان کی ''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم کی مختصر سی جلد چھپی۔ اسی سال مطبع نول کشور سے ان کا تعلق منقطع ہوا۔

اپنی جلد پنجم، حصۂ اول، کے اختتامیہ میں جاہ نے لکھا ہے کہ ''اور دفاتر مثل نوشیرواں نامہ و ایرج نامہ وغیرہ بموجب اپنے طرز کے ترجمہ کر کے طبع کروں گا'' (ص ۲۴۰)۔ لیکن جیسا کہ ہم جانتے ہیں، جاہ نے اس کے بعد کچھ نہ لکھا۔ یا اگر لکھا بھی تو ہمارے سامنے نہیں آیا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ ان کی ''ہوش ربا''، جلد پنجم، حصۂ اول، کو کچھ خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی ہو، اور جاہ نے بددل ہو کر اشاعت داستان کا کام روک دیا ہو، اور صرف داستان گوئی پر اکتفا کر لی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی زندگی کے آخری ایام عسرت اور/یا بیماری میں گزرے ہوں اور انہوں نے داستان گوئی بھی چھوڑ دی ہو۔

''طلسم ہوش ربا''، جلد سوم میں جاہ نے بعض باتیں ایسی لکھی ہیں جن سے ان کے حالات پر کچھ دھندلی روشنی پڑتی ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ ''ناقدری'' کی شکایت کرتے ہیں، اور یہاں تک لکھ جاتے ہیں کہ اب شاید وہ داستان نویسی نہ کریں۔ نول کشور پریس، کانپور کی اشاعت ۱۹۱۰ء، صفحہ ۸۰۲ پر داستان کے ایک نئے موڑ پر وہ ساقی نامہ لکھتے ہیں ؎

افسانے کے ناظرین ذیشان

ذی فہم و ہنرور و سخنداں

گر دیکھتے مہر کی نظر سے
اس ذرے کو آفتاب کرتے
اس وقت تھا فخر تجھ کو زیبا
لیکن مطلب میں تیرا سمجھا
برخاستہ دل ہوا ہے تیرا
ہے قول سے تیرے رنج پیدا
یہ تیسری جلد ختم کر کے
شاید کہ قلم نہ تو اٹھائے
پیدا نہیں جب کہ قدرداں ہے
محنت بے سود رائیگاں ہے

بظاہر یہ شکوۂ ناقدری ارباب مطبع سے ہے کہ وہ جاہ کو خاطر خواہ معاوضہ نہ دیتے رہے ہوں۔ اور ان کا یہ کہنا کہ شاید اب وہ آگے نہ لکھیں، ایک طرح کی دھمکی، یا بہتر سودا پٹ جانے کی درخواست تھی۔ لیکن ایک بات یہ بھی ہے کہ بیٹے بیٹی کی موت اور خود اپنی بیماری نے انہیں دل شکستہ بھی کر دیا تھا۔ اسی جلد کے صفحہ ۳۸۹ پر وہ کہتے ہیں ؎

شب تار و تاریکی رنج و غم
بلاؤں کا تھا سامنا دم بدم
زیادہ اندھیرے کا یہ تھا سبب
کہ گھر بے چراغ ہوگیا ہے یہ اب
اندھیرا نہ کیوں آئے مجھ کو نظر
جو کھوئے گئے دو ہوں نورِ نظر

☆☆

کبھی دل کو رویا جگر کو کبھی
کبھی دخترک کو پسر کو کبھی

Scanned by CamScanner

مری بعد فرزند دختر مری
اکیلا مجھے آہ وہ کر گئی

☆☆

تھے القصہ روشن مرے دل کے داغ
نہ اختر فلک پر نہ گھر میں چراغ
نہ تھا کوئی اس شب کو میرا انیس
غم و رنج دونوں کا تھا بس جلیس
یکایک ہوئی اک طرف روشنی
چمک مثلِ مہتاب پیدا ہوئی
جو دیکھا تو ہے شاہدِ خوش جمال
بھویں جن کی دونوں ہیں رشکِ ہلال

☆☆

اسی کے یہ تھی حسن کی بس ضیا
غرض وہ قریب آ کے کہنے لگا
کہ اے جاہ جانے دو یہ رنج و غم
مئے جام عشرت پیو دم بدم

☆☆

تو گویا ہوا مجھ سے وہ مہ لقا
کہ میں فیض ہوں تیرے ممدوح کا

☆☆

نہیں جانتا اس کو اے خوش مقال
وہ ہے مرتبہ دانِ اہلِ کمال

Scanned by CamScanner

نکل جائیں گے صاف قسمت کے بل
ہر اک ہے مہم اس کے ایما سے حل
ہے ظلِ ہما جس کا ظل کرم
وہ نام نول اور کشور بہم
پیو جام مے داد عشرت کی دو
بنام مبارک فسانہ لکھو

معلوم ہوتا ہے کہ جاہ کو اولاد کا غم باقی رہا لیکن اپنے ممدوح و مربی سے جو توقعات انہیں تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ اسی جلد سوم کے اختتام کے قریب (ص ۹۲۰) جاہ لکھتے ہیں:

بڑے انتشار و پریشانی میں اس جلد کو میں نے لکھا ہے۔ اولاد کا غم دل کو رہا ہے، بہت عرصہ تک خود علیل رہا، ضعف دل و دماغ رہا...... فی الجملہ حضرات سخن سنج داد دیں گے اور مجھ کو بہ نیکی یاد کریں گے۔ اور میں، خدا چاہے گا تو آئندہ قصہ بیان کرنے کی نسبت بذریعۂ اشتہار اطلاع دوں گا۔

یہاں قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ جاہ نے داستان گویوں کے طریقے کے برعکس، یہاں اپنے مربی کا ذکر نہیں کیا ہے کہ ان کی عنایت ہوئی اور تقاضا ہوا تو اور لکھوں گا۔ اس کے برخلاف وہ لکھتے ہیں کہ آئندہ قصے کے ''بیان کرنے'' کی ''اطلاع بذریعۂ اشتہار'' دی جائے گی۔ یعنی ''طلسم ہوش ربا''، جلد سوم، کی تحریر ختم ہوتے ہوتے انہوں نے یا تو فیصلہ کرلیا تھا کہ اب داستان لکھیں گے ہی نہیں، صرف زبانی بیان کریں گے، یا پھر ان کا ارادہ تھا کہ پریس کی نوکری چھوڑ کر اب وہ اپنا کاروبار شروع کریں گے۔ پہلا مفروضہ زیادہ قابلِ وثوق ہے، کیونکہ بہرحال محمد حسین جاہ نے ''طلسم ہوش ربا'' جلد چہارم لکھی اور مطبع نے اسے چھاپا۔ اس کا مطلب یہ نکل سکتا ہے کہ زبانی داستان سرائی کا ان کا ارادہ پورا نہ ہو سکا، لہٰذا انہوں نے نوکری نہیں چھوڑی۔ مربی کی فرمائش، یا حکم، یا موجودہ اور متوقع کرم نمائیوں کا ذکر (جو احمد حسین قمر اور شیخ تصدق حسین کے

Scanned by CamScanner

یہاں بار بار ملتا ہے) محمد حسین جاہ کے یہاں کہیں نہیں ہے۔ "طلسم ہوش ربا" جلد دوم کے اختتام (ص ۹۸۵) پر وہ لکھتے ہیں کہ داستان سرائی سے بوجہ اختصار صرف "..." بیان کیا کرتا ہے۔ ہر جلد کے آخر میں وہ کچھ الفاظ بطور لکھتے ہیں جن سے اگلی جلد اور واقعات آئندہ کی کچھ خبر ملتی ہے۔ اس کے برخلاف "طلسم ہوش ربا" جلد چہارم اول کا اختتام یوں ہوتا ہے (۱۹۱۳ء کا کانپوری ایڈیشن ص ۱۲۷۹):

> ایک مرد صاحب کمال جن کی داڑھی ناف تک ہے اور بال بکھرے رخسار پر پڑے تھے، عبا گلے میں پہنے عمامہ سر پر باندھے صحیفۂ ابراہیمی کی تلاوت کر رہے ہیں۔ لقا کے پاؤں کی آہٹ پا کے انہوں نے سر اٹھایا اور کہا، "او لقا تو یہاں کیوں آیا، جا یہاں سے!" لقا بھی اس کو مرد خدا پرست سمجھ کر تخت پر سوار ہو کر اپنے لشکر میں آیا۔

عبارت کی بے ربطی اور بیانیہ کی غیر اختتام پذیری صاف ظاہر ہے، اور اس سے بھی زیادہ یہ بات ظاہر ہے کہ مسودہ نامکمل ہی حالت میں جاہ کے ہاتھوں سے لے لیا گیا، یا خود انہوں نے ارباب مطبع کے شبانہ روز تقاضوں سے تنگ آ کر انہیں دے دیا۔ اول الذکر امکان زیادہ قرین قیاس ہے، کیوں کہ اگر جاہ خود سے مسودہ داخل پریس کرتے تو کچھ اختتامی عبارت تو لکھتے، یا آئندہ جلد کی خبر دیتے۔ ان سب باتوں کی عدم موجودگی، اور عبارت کی بے ربطی کم و بیش ثابت کر دیتی ہے کہ پریس اور جاہ کے تعلقات اب ختم ہو رہے ہیں یا ختم ہو چکے ہیں، اور تجدید تعلقات کا امکان معدوم نہیں تو بہت دھندلا ضرور ہے۔

☆☆☆

اس بات کا امکان ہے کہ عمر کے لحاظ سے احمد حسین قمر نے محمد حسین جاہ سے زیادہ عمر پائی۔ یہ تو یقینی ہے کہ ان دونوں میں قمر زیادہ معمر تھے۔ جاہ کو "بالا باختر" کی اشاعت مورخہ ۱۹۰۰ء کے صفحۂ اوّل پر "مرحوم" لکھا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۱۸۹۹ء میں، یا اس کے آس پاس ہوا ہوگا، لیکن ان کی تاریخ پیدائش یا تعلیم و تربیت وغیرہ کے بارے میں کچھ

Scanned by CamScanner

معلوم نہیں۔ ان کے اصل وطن کے بارے میں بھی ہمیں کوئی اطلاع نہیں۔ اغلب ہے کہ وہ لکھنؤ ہی کے رہے ہوں۔ ''طلسم فصاحت'' (نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۸۸۱ء) کے صفحہ ۷ پر انہوں نے خود کو ''سید محمد حسین ابن سید غلام حسین رمال ساکن لکھنؤ تخلص جاہ'' لکھا ہے۔ ''ساکن'' سے توطن بھی مراد ہو سکتی ہے اور مستقل قیام بھی۔ چونکہ انہوں نے اپنے والد کو ''رمال'' بیان کیا ہے تو گمان گزرتا ہے کہ یہ لوگ لکھنؤ کے اصل باشندے، یا وہاں مدت سے قیام پذیر ضرور رہے ہوں گے، کہ رمالوں کے مربی، اور ان سے استفادہ کرنے کے جویا حضرات شہروں میں عموماً زیادہ ہوتے ہیں۔

اسے تاریخ کی ستم ظریفی ہی کہیے کہ جہاں ہمیں جاہ کی پیدائش اور اوائل عمر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم، وہاں ان کے ''استادوں'' کے بارے میں ہمیں طرح طرح کی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ مثلاً گیان چند نے لکھا ہے (صفحہ ۷۲۹) کہ وہ ''بڑے منشی فدا علی کے شاگرد تھے اور 'چھوٹے منشی' کے نام سے مشہور تھے۔'' گیان چند نے کوئی سند نہیں دی ہے، لیکن ان کا بیان غالباً خواجہ عبدالرؤف عشرت کے مضمون ''لکھنؤ کی داستان گوئی'' سے ماخوذ ہے۔ آگے چل کر صفحہ ۷۳۱ پر گیان چند نے آغا جانی کاشمیری کی خودنوشت ''سحر ہونے تک'' کا ایک اقتباس دیا ہے جس میں جاہ کو قمر کا چھوٹا بھائی بیان کیا گیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ دونوں صاحبان ''سیکڑوں آدمیوں'' کے مجمعے میں داستان سناتے تھے اور منشی نول کشور کے کاتب انہیں لکھتے جاتے تھے۔

ظاہر ہے کہ آغا جانی کاشمیری کے یہ سب بیانات محلِ نظر ہیں۔ لیکن گیان چند کا یہ قول بھی بے ثبوت اور غالباً غلط ہے کہ جاہ کے استاد میر فدا علی تھے اور میر فدا علی کو ''بڑے منشی جی'' اور جاہ کو ''چھوٹے منشی جی'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ داستان کی کسی جلد میں، اور نہ ہی کسی اور معاصر یا قریب العہد مطبوعہ ماخذ میں یہ باتیں مذکور ہیں۔ اس کے برخلاف، خود داستان میں جو شہادتیں ہیں ان میں کئی لوگوں کے نام جاہ کے استادوں کی حیثیت سے مذکور ملتے ہیں۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد دوم (نول کشور پریس، کانپور، ۱۹۱۲ء، ص ۹۵۷) پر جاہ کی لکھی ہوئی ایک تاریخ

Scanned by CamScanner

درج ہے۔ اس کا عنوان ہے: ''از محمد حسین جاہ مترجم و مولف طلسم ہٰذا تلمیذ سحر مرحوم۔'' سحر کی کچھ تفصیل درج نہیں، لیکن چونکہ صرف تخلص لکھا ہے تو اس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کوئی مشہور شخصیت رہے ہوں گے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا انتقال ''طلسم ہوش ربا''، جلد دوم کی پہلی طباعت کے کچھ مدت پہلے ہوا ہو۔ بہرحال، یہ دوسری بات تو بالکل مفروضہ ہے، لیکن پہلی بات کے ٹھیک ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ سحر، لکھنؤ کے مشہور استاد امان علی سحر ہوں۔

حسرت موہانی نے ''تذکرۂ شعرا'' کے نام سے متفرق مضامین تذکرے کے رنگ میں، لیکن جدید انداز کے حامل، لکھے تھے۔ ان میں سے کچھ کو احمر لاری نے ''تذکرۂ شعرا'' کے نام سے ۱۹۷۲ء میں شائع کر دیا۔ پھر شفقت رضوی نے تمام تذکروں کو یکجا کر کے ''تذکرۃ الشعرا'' کے نام سے ایک نہایت ضخیم جلد مع حواشی و استدراکات شائع کی (کراچی، ۱۹۹۹ء)۔ مؤخرالذکر کے صفحہ ۵۸۳ پر امان علی سحر کا تذکرہ شروع ہوتا ہے اور وہاں ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۰۴ء، اور تخمینی تاریخ وفات ۱۸۸۵ء لکھی ہوئی ہے۔ لیکن اس تاریخ میں دو مشکلیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اسی ''تذکرۃ الشعرا'' کے صفحہ ۵۸۴ پر صفیر بلگرامی شاگرد امان علی سحر کے تذکرے ''جلوۂ خضر'' کے حوالے سے یہ درج ہے کہ سحر کا انتقال اس وقت ہوا جب وہ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے فرو ہونے پر کانپور سے لکھنؤ واپس جا رہے تھے۔ صفیر بلگرامی چونکہ سحر کے شاگرد تھے لہٰذا توقع کی جاسکتی ہے کہ انہیں اپنے استاد کی تاریخ وفات معلوم ہو گی۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سحر کا انتقال کبھی ۱۸۵۸ء میں ہوا اور یہاں ''تذکرۃ الشعرا'' میں ۱۸۸۵ء سہوِ کاتب ہے۔ دوسری بات یہ کہ سحر کا دیوان ''ریاض سحر'' مطبوعہ مطبع کارنامۂ لکھنؤ مورخہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۲/۱۸۷۳ء میرے پیش نظر ہے۔ اس میں سحر کو مرحوم لکھا گیا ہے۔ لہٰذا اگر یہ تاریخ اشاعت درست ہے تو امان علی سحر کا انتقال مارچ ۱۸۷۲ء (آغاز سال ۱۲۹۰ ہجری) کے پہلے ہو چکا تھا۔ تاریخ کی درستی کی شرط میں نے اس لیے لگائی کہ ممکن ہے یہ اشاعت ۱۸۷۲/۱۸۷۳ء کے بعد کی ہو، لیکن اس پر تاریخ اول اشاعت کی (۱۲۹۰ ہجری مطابق ۱۸۷۲/۱۸۷۳ء) ہی رہنے دی گئی ہو۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ سعادت خان ناصر کا تذکرہ ''خوش معرکۂ زیبا'' ۱۸۴۶ کے

Scanned by CamScanner

آس پاس شروع کیا گیا لیکن اس میں ترمیمیں اور اضافے ۱۸۷۱، یا کم سے کم ۱۸۶۹ء تک کئے جاتے رہے۔ اس تذکرے میں سحر کے اشعار یہ لکھ کر درج کئے گئے ہیں، ''یہ اشعار اس سے یادگار۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ عبارت لکھی گئی اس وقت امان علی سحر کا انتقال ہو چکا تھا۔ لہٰذا اغلب ہے کہ سحر کا انتقال ۱۸۵۸ء میں کبھی ہوا ہو، جیسا کہ ''جلوۂ خضر'' کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اس بات کا امکان کم ہو جاتا ہے کہ جاہ کے نظم کردہ قطعۂ تاریخ میں انہیں جس ''سحر مرحوم'' کا شاگرد بتایا گیا ہے، وہ یہی شیخ امان علی سحر، شاگرد ناسخ تھے۔ لیکن چونکہ امان علی سحر کے بارے میں کوئی بیان یا گمان ان کے داستان گو ہونے کا نہیں ہے، لہٰذا اغلب ہے کہ اگر وہ (یعنی امان علی سحر یا کوئی اور سحر) جاہ کے استاد تھے تو فن داستان گوئی میں نہیں بلکہ فن شاعری میں تھے۔

''طلسم ہوش ربا'' جلد دوم، کی اسی اشاعت میں صفحہ ۹۶۱ پر ایک قطعۂ تاریخ حسب ذیل عنوان سے ہے:

تاریخ از حضرت اوستادی گوہر آبدار معنی
کے صدف منشی اشرف علی اشرف مرحوم خوش نویس
اعلیٰ پایگاہ مطبع اودھ اخبار

اس قطعے کا پہلا شعر ہے ؎

ہیں شاگرد میرے محمد حسین
لقب ان کا ہے جاہ با صد وقار

اس طرح یہ بات ثابت ہے کہ محمد حسین جاہ کے ایک استاد اشرف علی المتخلص بہ اشرف بھی تھے، اور یہ صاحب مطبع اودھ اخبار (یعنی نول کشور پریس) کے ''خوش نویس اعلیٰ'' تھے۔ قطعۂ زیر بحث میں کوئی اشارہ اس بات کا نہیں کہ جاہ اور اشرف میں استادی شاگردی کا رشتہ کس علم کی نسبت سے تھا، لیکن اغلب ہے کہ جاہ خوش نویس بھی رہے ہوں، یا خوش نویس بننے کا انہوں نے اوائل عمری میں ارادہ کیا ہو اور اس سلسلے سے وہ اشرف کے شاگرد ہوئے ہوں۔

Scanned by CamScanner

محمد حسین جاہ نے خوش نویسی کبھی بطور پیشہ یا مشغلہ اختیار کی ہو، اس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ امیر حسن نورانی کی کتاب ''منشی نول کشور اور ان کے خطاط اور خوش نویس'' (نئی دہلی، ۱۹۹۴ء) کے صفحات ۶۴ تا ۶۶ پر منشی اشرف علی اشرف کا حال ملتا ہے۔ لیکن جاہ کی شاگردی کا کوئی ذکر وہاں نہیں ہے، اور نہ ان کے شاعرانہ مرتبے پر کوئی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس بات کا بھی ذکر نہیں کہ جاہ ان کے شاگرد تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ محمد حسین جاہ نے خوش نویسی میں اشرف علی اشرف کی شاگردی ضرور کی ہو گی، لیکن بحیثیت خوش نویس انھوں نے کوئی نقوش نہیں چھوڑے۔ احترام الدین شاغل کی ''صحیفۂ خوش نویساں'' میں اشرف کا ذکر ہے نہ جاہ کا۔ جاہ کا مذکور نہ ہو تو کچھ حیرت نہیں، لیکن اشرف، جنھوں نے فیضی کی ''سواطع الالہام'' جیسی کڈھب کتاب کی کتابت نہایت جانفشانی اور حسن اور درستی سے کی تھی، ان کے نام نہ ہونا تعجب اور افسوس کی بات ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذکر کے لائق ہے کہ خوش نویسی میں چاہے جاہ نے کوئی نام نہ حاصل کیا ہو، لیکن ''طلسم ہوش ربا'' میں ان کے جو اشعار ملتے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر وہ اعلیٰ درجے کے تھے اور شاعری کے فن میں اپنے استاد کے لیے انھیں سرمایۂ افتخار کہا جا سکتا ہے۔

بہرحال، یہ بات یقینی ہے کہ شاعری کے فن میں جاہ کو سحر تخلص کے کسی شاعر سے تلمذ تھا اور ''سحر'' شاید امان علی سحر ہوں۔ اور یہ بات بھی تقریباً یقینی ہے کہ خوش نویسی میں وہ منشی اشرف علی اشرف کے شاگرد تھے۔ لیکن داستان گوئی میں کس کے شاگرد تھے، یہ معاملہ اب بھی بہت پیچیدہ ہے۔ گیان چند کے قول کو درست مانیں تو میر فدا علی عرف ''بڑے منشی'' نے جاہ کو داستان گوئی سکھائی تھی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، پروفیسر گیان چند نے اپنی اطلاع کا ماخذ نہیں درج کیا ہے۔ موجودہ صورت میں یہ محض اطلاع ہے، تاریخی بیان نہیں کہی جا سکتی، خصوصاً جب ہم دیکھتے ہیں کہ ''طلسم فصاحت'' کے ۱۸۸۱ء ایڈیشن میں جاہ نے احمد حسین قمر کو اپنا استاد کہا ہے اور ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں۔

میں نے ۱۸۸۱ء ایڈیشن کا ذکر بطور خاص کیا ہے، کیونکہ ۱۸۷۴ء کا ایڈیشن (یعنی اول ایڈیشن) میرے پیشِ نظر نہیں، لیکن ۱۸۸۴ء کا ایڈیشن پیش نظر ہے۔ اس میں احمد حسین قمر کا کوئی

Scanned by CamScanner

ذکر نہیں، تحسین و ستائش تو بڑی بات ہے۔ ''طلسم فصاحت'' کے ۱۸۸۱ء ایڈیشن کے صفحہ ۲۷۸ پر البتہ حسب ذیل عنوان سے جاہ کی ایک بہت طویل عبارت چھاپی گئی ہے۔

توصیف جناب اوستاد منشی احمد حسین صاحب قمر کہ داستان گوئی میں جن کا حقیر شاگرد ہے اور فسانہ کو دکھایا ہے

اس کے بعد قمر کی تعریف میں وہ وہ مبالغے جاہ نے کیے ہیں اور اپنی خاکساری کا ایسا بیان کیا ہے کہ کبھی کبھی گمان گزرتا ہے کہ جاہ سنجیدہ نہیں ہیں بلکہ احمد حسین قمر کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ یعنی ایک امکان یہ ہے کہ قمر نے شاید کبھی جھوٹا دعویٰ کیا ہو کہ جاہ میرے شاگرد ہیں، اور جاہ اب اس کا بدلہ نکال رہے ہوں۔ یا دوسرا امکان یہ ہے وہ کبھی قمر کے شاگرد تھے اور بعد میں ناچاقی کی بنا پر جاہ ان سے الگ ہو لئے، اور اب یہاں اپنی داستان کے شائع ہو جانے کے تفاخر میں قمر کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ یا پھر وہ اہلِ زمانہ کا مذاق اڑا رہے ہیں جنھیں شاید خیال تھا کہ محمد حسین جاہ نے داستان گوئی کا فن احمد حسین قمر سے حاصل کیا ہوگا۔ لیکن مذاق اڑانا، اور وہ بھی اس بے دردی سے، خواہ قمر کا، خواہ اہلِ زمانہ کا، بھی بہرحال مستبعد ہے، کہ اس میں دو قباحتیں ہیں۔ اول تو یہ کہ جاہ کی جو تحریریں ہمارے سامنے ہیں، ان میں کسی عبارت سے کہیں بھی کوئی کینہ یا اس طرح کی سنگدلی نہیں مترشح ہوتی کہ وہ کسی شخص کے بارے میں، چاہے وہ ان کا سابق استاد یا مبینہ استاد کیوں نہ ہو، ایسے انداز کی تحریر لکھ سکتے ہوں۔ دوسری بات یہ کہ مانا محمد حسین جاہ اتنے ہی کینہ پرور تھے، لیکن منشی نول کشور کب گوارا کرتے کہ احمد حسین قمر کے خلاف ان کی ذاتی مخاصمت اور عناد ان کے یہاں کی کسی کتاب کے صفحات پر یوں منعکس ہو کہ معاصرین فوراً بات کی تہہ کو پہنچ جائیں۔ نول کشور بہرحال صلح کل کے آدمی تھے اور بزرگوں کی وضع کے پابند تھے۔ یہ بات تقریباً غیر ممکن ہے کہ ان کے پریس سے شائع شدہ کسی کتاب میں کوئی معاصر مصنف کسی اور کے بارے میں اپنے دل کا غبار نکالے۔

لیکن اس بات کو کیا کیجیے کہ اگر جاہ نے قمر کا مذاق اڑا کر ان کی توہین نہیں کی ہے تو زیر بحث عبارت میں انہوں نے احمد حسین قمر کی مدح میں مبالغے اور تفرس و تعرب کی وہ شان

Scanned by CamScanner

دکھائی ہے کہ ابوالفضل یاد آ جاتا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر نہ پڑھیں تو عبارت سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ اور اس پر طرہ یہ کہ کتابت کے (بظاہر) اغلاط بہت سے ہیں۔ بہر حال، نمونہ ملاحظہ ہو (ص ۲۷۸ تا ۲۷۹)

جس وقت تمام فسانہ زیب تحریر ہوا، حضرت اوستاد سے یوں عرض پیرا یہ حقیر ہوا کہ اگر اصلاح حضور کی ہو جائے، رو سیاہی چہرۂ کتاب کی دھو جائے، الفاظ و مضامین کا وہ رنگ بندھے اور وہ معنی غریب پیدا ہوں، کہ وضع لطافتِ رسم الخط سے شیوۂ دلبری ہویدا ہو کر مانند معشوق عشوہ سنج با کرشمہ و ناز کے، یہ کتاب آمادۂ دلبری اور دلداری مشتاقان باوفا ہو، سوادِ اسطارتحریرحرف زنِ شامِ سوسَنی رنگ ہو...... جس وقت شمعِ زبان رشک کلیم کی روشنی اصلاح بخشے، صفحہ غیرت دہِ طور بن کر شعلہ وار فانوس خیال معشوقاں و مشتاقاں دم زنیِ نسیم گفتارِ شرربارِ حضور لامع النور سے چشم مردمان بصارت میں جلوہ گری کرے۔ جب یہ الفاظ مجہو، موصل تلفظ اثبات تقریر، سامنے حضرت کے کیے، زبان معجز بیان سے دامن حال میں شکستہ بال کے یوں گوہر افشاں ہوئے کہ، ''تو نے ناحق بے فائدہ میرا سر پھرایا، اور اپنے تئیں بھی انگشت نمائے چشم آہو گیراں بنایا۔ یہ تمام کتاب لائق اصلاح کب ہے؟ تیری یہ یاوہ گوئی سراسر بے مطلب ہے۔'' میں نے پھر دست عجز دامن اقدس پر مارا۔ ہٹ کر کے عرض کیا کہ، ''گل راز خار، و ساحل را از خس و خاشاک، ننگ و عارنمی باشد۔ میں اس تکلیف دہی سے باز نہ آؤں گا، تمام کتاب دکھلاؤں گا۔'' اس وقت، کہ مجھ پر نہایت پرورش اور لطف و کرم فرماتے ہیں، سراسری بہ نگاہ کرم اس قلزم بحر زخار معنی نے چشمۂ کتاب کو سیراب اصلاح فرمایا۔ کم ترین، لب تشنۂ آب مضمون، ساحل مطلب سے آشنا ہوا۔ یہ ایک قطرہ اس کے فیض عمیم اور لطف دریائے علم کا ہے۔ زہے نہنگ بحر علمیت و شاعری، و

خبے مہر سپہر سخنوری، کہ اگر زبان پارسی میں شمع زباں سے شعر، لمعہ پذیر ہو، ہر شعشۂ حرف پر زردشت، حسن سخن زند کو اپنے، نثار آتش کدۂ بیان کرے......

وغیرہ وغیرہ۔ یقین نہیں آتا کہ یہ سب سنجیدگی سے لکھا گیا ہوگا۔ لیکن بہرحال کتاب ہمارے سامنے ہے۔ میرے پیش نظر ''طلسم فصاحت'' کے اس نسخے کی فوٹو نقل ہے جو میں نے بوڈلین لائبریری، آکسفورڈ سے خود حاصل کی تھی۔ اس وقت میں نے یہ غور نہ کیا تھا کہ اس نسخے میں ۲۸۱ تا ۲۸۴ موجود نہیں ہیں۔ اس نسخے میں صفحہ ۲۸۵ پر کسی اور صاحب کی تقریظ گذشتہ صفحے سے چلی آ رہی ہے۔ یہ تقریظ خود محمد حسین جاہ کی مدح میں ہے اور صفحہ ۲۸۶ پر ختم ہوتی ہے۔ مجھے یہ معلوم کرنے کی فکر تھی کہ احمد حسین قمر کی تعریف میں جاہ نے خدا جانے اور کیا کیا شگوفے چھوڑے ہیں۔ ممکن ہے پوری عبارت سامنے ہو تو اس عجیب و غریب تحریر کا کچھ ٹھیک سے مطلب نکل سکے۔ اور یہ بھی کرید تھی کہ جاہ کی مدح میں تقریظ کن صاحب کی ہے۔ ٹورانٹو میں مقیم انگریزی کے ناول نگار اور داستان کے لائق طالب علم میرے دوست مشرف فاروقی جو حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی کے چھوٹے بھائی کے پوتے ہیں، انہوں نے داستان امیر حمزہ (یک جلدی) کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے اور اب وہ ''طلسم ہوش ربا'' پر کام کر رہے ہیں۔ ان سے ذکر آیا تو انہوں نے ٹورانٹو یونیورسٹی لائبریری سے ''طلسم فصاحت'' کے صفحات ۲۸۱ تا ۲۸۴ کی فوٹو نقل از راہ کرم مجھے بھیج دی۔ ٹورانٹو یونیورسٹی لائبریری کا ایڈیشن ۱۸۸۴ء کا نکلا اور ان صفحات کو دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ احمد حسین قمر کا ذکر اس ایڈیشن سے بالکل غائب ہے۔

جاہ نے ۱۸۸۴ء کے ایڈیشن میں خاتمۂ افسانہ میں تھوڑی بہت عبارت گھٹا بڑھا کر داستان کو صفحہ ۲۸۲ کی پہلی سطر پر تمام کر دیا ہے۔ پھر صفحہ ۲۸۴ کے وسط تک تاریخیں ہیں۔ ان کے بعد اسی صفحے پر جاہ کی مدح میں وہ تقریظ شروع ہوتی ہے جس کا ایک حصہ ۱۸۸۱ء ایڈیشن کے آخری ڈیڑھ صفحے (۲۸۶/۲۸۵) میں نظر آتا ہے اور کتاب اسی پر تمت بالخیر ہوتی ہے۔ ٹورانٹو سے مرسلہ صفحات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تقریظ کے مصنف ''حضرت ابوالفتح شمس الدین

Scanned by CamScanner

سلطان محمد علی نقی میرزا صفوی عرف صاحب عالم وارث ایران مرحوم و مغفور'' ہیں۔ ان صاحب کے بارے میں کچھ نہ معلوم ہو سکا، سوا اس کے کہ وہ ۱۸۷۴ء میں (یا ۱۸۸۱ء کے پہلے) اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے بارے میں معلومات ہمارے لیے ضروری بھی نہیں۔ اصل دلچسپی کی بات یہ ہے کہ ۱۸۸۴ء کے ایڈیشن میں وہ مبالغہ آمیز، مفرس و معرب تمدیح احمد حسین قمر موجود نہیں جو ۱۸۸۱ء کے ایڈیشن میں تھی (اور اغلب ہے کہ ۱۸۷۴ء کے بھی ایڈیشن میں رہی ہو)۔

احمد حسین قمر کی مدح کے حضور و غیاب سے ہم کئی نتیجے نکال سکتے ہیں، لیکن کوئی بھی نتیجہ حتمی نہیں کہا جا سکتا:

(۱) جاہ کو قمر سے تلمذ نہ تھا۔ لیکن قمر نے شاید کہیں کہہ دیا، یا لکھ دیا کہ جاہ میرے شاگرد ہیں۔ لہٰذا جاہ نے قمر کی ہنسی اڑائی۔ بعد میں کسی بنا پر (ممکن ہے منشی نول کشور کی فہمائش پر) انہوں نے وہ ساری عبارت حذف کر دی، یا وہ عبارت منشی صاحب کے حکم پر حذف کر دی گئی۔

(۲) جاہ کو قمر سے تلمذ تھا، بعد میں ناچاقی ہو گئی۔ یہ ناچاقی ۱۸۸۱ء کے بعد ہوئی۔ لہٰذا ۱۸۸۱ء کے بعد جو ایڈیشن ''طلسم فصاحت'' کا نکلا، اس میں جاہ نے قمر کی توصیف پر مبنی عبارت حذف کر دی۔

(۳) جاہ کو قمر سے تلمذ نہ تھا۔ انہوں نے پیشہ ورانہ رشک کی بنا پر قمر کو ذلیل کرنے کے لیے تاکید المدح بما یشبہ الذم پر مبنی عبارت لکھی۔

(۴) یہ سارے کا سارا کوئی عملی مذاق (Practical Joke) تھا، جسے بعد میں خود جاہ نے مسترد کر دیا۔

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا میں سے کوئی توجیہ پوری طرح مطمئن نہیں کرتی۔ یہ ممکن ہے کہ جاہ نے کبھی قمر کی شاگردی کی ہو، لیکن یہ بھی ہے قمر اپنے ''رقیبوں'' یا ''حاسدوں'' پر طنز و تشنیع کرنے کا کوئی موقع نہیں چھوڑتے۔ انہوں نے جاہ کا نام لیے بغیر ان کی خوب برائیاں کی ہیں،

Scanned by CamScanner

لیکن کہیں دور کا اشارہ بھی نہیں کیا کہ جاہ میرے شاگرد رہ چکے ہیں۔ قمر کے مزاج میں بڑبولا پن بے حد تھا۔ یہ بالکل بعید از قیاس ہے کہ جاہ ان کے شاگرد کبھی رہے ہوں اور قمر نے اس بات کا تذکرہ نہ کیا ہو۔ یقیناً یہ ممکن ہے کہ قمر نے قسم کھا لی ہو کہ جاہ کی شاگردی کا کوئی بھی اشارہ نہ کریں گے، لیکن یہ امکان بہت کمزور سا ہے۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں مجھے پہلا امکان زیادہ قرین قیاس لگتا ہے۔ اور جاہ کے خلاف قمر کے دل میں جو تلخی نظر آتی ہے، اس کی توجیہ بھی امکان نمبر ایک کے ذریعہ بہتر طریقے سے ہو سکتی ہے۔

اپنے معاصر یا بزرگ داستان گویوں میں جاہ نے انبا پرشاد رسا کا ذکر کیا ہے۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد سوم (نول کشور پریس کانپور، ۱۹۱۰ء، صفحہ ۷۹۵) میں وہ ''انبہ پرشاد صاحب جو ایک بڑے داستان گو لکھنؤ کے تھے'' کے حوالے ایک وقوعے کا ایک روپ بیان کرتے ہیں جو ''صاحب دفتر'' کے بیان کئے ہوئے روپ سے ذرا مختلف ہے۔ اسی جلد کے صفحہ ۸۷۹ پر وہ انبا پرشاد کی ایک یازدہ شعری اردو مثنوی ان کے نام سے نقل کرتے ہیں۔

شیخ تصدق حسین کو بھی محمد حسین جاہ نے نہایت فیاضانہ خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد سوم (طبع نول کشور پریس، کانپور، ۱۹۱۰ء، ص۴۹۳) میں جاہ نے لکھا ہے:

> صاحب دفتر نے حال جہانگیر نہیں لکھا ہے، بلکہ یہ ٹکڑا میرے ایک دوست تصدق حسین نامی داستان گو ہیں، انہوں نے خود بیان کیا تھا، اپنی طبیعت سے۔ اس کو داستان کہنے والوں نے پسند کر کے محفلوں میں قصہ خوانی کے بیان کیا، اور ہر شخص نے لکھنؤ میں سنا۔ پس میں نے بخیال اس کے کہ ناظرین میرے کلام کے بھی اس داستان سے حظ اٹھائیں، و نیز کوئی یہ نہ کہے کہ اتنا مضمون ہم نے قصہ خواں سے زیادہ سنا تھا، اس کتاب میں وہ نہیں ہے، کیونکہ یہ داستان بہت مشہور ہو چکی تھی۔

میر احمد علی کا نسبۃً تفصیلی ذکر جعفر علی ہنر فیض آبادی نے ''طلسم ہوش ربا''، جلد دوم، کی تقریظ (ص۹۶۰) پر کیا ہے۔ اور یہ ذکر اس طرح ہے کہ جاہ کی تعریف تو ہے ہی، لیکن میر احمد علی

Scanned by CamScanner

کو بھی خراج عقیدت پیش کر دیا ہے۔ ہنر فیض آبادی لکھتے ہیں:

> اس دفتر داستان کو فیضی علیہ الرحمہ نے بہ زبان فارسی لکھا تھا جس میں بڑی بڑی داستانوں کا صرف پتہ تھا۔ اس میں سے میر احمد علی صاحب داستان گو نے اس طلسم کو داستان کہنے والوں کے لیے پتے وار لکھا تھا۔ وہ بھی دستیاب ہونا کمال دشوار تھا۔ جاہ صاحب موصوف نے سعی بے شمار و تلاش بسیار فرما کر بہم پہنچایا......

''طلسم ہوش ربا''، جلد چہارم، کے صفحہ ۶۷۶ پر جاہ نے قمر کے شعر نقل کئے ہیں۔ اگر جاہ کی ''طلسم ہوش ربا'' جلد پنجم کی طباعت میں ان کے شریک مہتمم سید محمد اسمٰعیل کو داستان گو محمد اسمٰعیل اثر فرض کر لیا جائے تو یہ بھی ایک معاصر داستان گو کا حوالہ کہا جا سکتا ہے۔

محمد حسین جاہ نے کیا عمر پائی، اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا، انہوں نے شیخ تصدق حسین کو اپنا دوست لکھا ہے، اور شیخ تصدق حسین غالباً احمد حسین قمر سے چھوٹے تھے، جیسا کہ آئندہ صراحت کی جائے گی۔ اگر محمد حسین جاہ نے ۱۸۹۹ء میں وفات پائی، جیسا کہ تقریباً یقینی ہے، اور قمر نے ۱۹۰۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، جیسا کہ معلوم ہے، تو محمد حسین جاہ نے نسبتہً کم سنی میں انتقال کیا ہوگا۔

محمد حسین جاہ کی زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ کہنا فی الحال غیر ممکن ہے، بجز اس کے کہ معاصر اور بزرگ داستان گویوں کے تئیں ان کا دوستانہ اور فراخ دلانہ رویہ ان کی سلامت طبع اور نیک مزاجی کی دلیل ہے۔

احمد حسین قمر

(وفات، ذی قعدہ ۱۳۱۸ھ، مطابق فروری - مارچ ۱۹۰۱ء)

قمر کے انتقال کی تاریخ ہمیں ''ہومان نامہ''، مصنفہ احمد حسین قمر، مطبوعہ ۱۹۰۱ء، کی تقریظ بطور خاتمہ الطبع مصنفۂ اشتیاق حسین سہیل میں ملتی ہے۔ سہیل، جو قمر کے بیٹے تھے، لکھتے ہیں (ص ۸۱۴):

Scanned by CamScanner

حقیقت میں یہ طرزِ بیان اور طلاقت زبان اور دلچسپی حالات، والد ماجد صاحب کا حصۂ خداداد ہے۔کوئی اس میں شریک و سہیم نہیں ہوسکتا۔مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ایسے ہمہ داں اور باکمال اور ہر دل عزیز کا انتقال ماہ ذی قعدہ ۱۳۱۸ ہجری میں ہوگیا۔ احقر کے نزدیک تو داستان طرازی کا چراغ گل ہوگیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

پروفیسر گیان چند نے احمد حسین قمر کے بارے میں یہ اطلاع بہم پہنچائی ہے (صفحہ ۷۳۰) کہ ''۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں قمر کے دو بھائی کام آئے۔ ذریعہ معاش کے طور پر قمر نے وکالت کی سند حاصل کرنا چاہی لیکن اس میں ناکام رہنے پر داستان گوئی کا پیشہ اختیار کیا۔'' گیان چند نے ان بیانات کا ماخذ نہیں واضح کیا ہے۔لیکن ''طلسم ہوش ربا''، جلد ششم، کے آغاز میں قمر نے اپنے بارے میں حسب ذیل معلومات درج کی ہیں (کانپور، نول کشور پریس، ۱۸۹۳ء، ص ۳-۴)۔ اغلب ہے کہ گیان چند نے یہ اطلاعات وہیں سے اخذ کی ہوں:

حالات حقیر پر تقصیر سے ناظرین والا مقام آگاہ ہوں کہ یہ داستان سرائی پیشۂ جد و آبائی نہیں ہے۔ ایام غدر باغیان میں قریب پل آہنی آں رائے گومتی مکان سکونت اس حقیر کا تھا۔ بروقت آمد فوج سرکاری چانکہ دو بھائی راقم کے مرزا بندہ حسن و بندہ حسین، ناظم علاقہ، بھندرو، کولھو، اگاڑھ وغیرہ تھے، اور حقیر بھی علاقۂ متعلقہ امام باغ، جاگیر نواب علی نقی خان مرحوم تھا، فوج ظفر موج دروازے پر موجود تھی، لڑائی ہوئی۔ دونوں بھائی و بسیار کس ملازمان قدیم سیار گلشن جناں ہوئے۔ حقیر بعنایت رب اکبر بچ گیا۔ جرم بغاوت سے بریت ہوئی، مگر مکانات و جائداد و علاقہ وغیرہ قریب سہ لاکھ روپیہ ضبط سرکار ہوئے۔ بہ سبب صغر سنی دعویٰ اس کا نہ کر سکا۔ وراثت جد و آبا سے محروم رہا۔ اول قانون یاد کر کے برابر کچہری میں مختاری کی۔ جب وقت امتحان آیا، اسی جرم بغاوت میں امتحان

Scanned by CamScanner

نامنظور ہوا۔ اس وقت سے طبیعت بہلانے کو شوق داستان سرائی ہوا۔
چونکہ کوئی وجہ معاش نہ تھی، رزاق مطلق نے اس پیشے میں سواد کامل عطا
فرمایا۔ دیگر نثر خوانی مصائب آل عبا علیہ التحیۃ والثنا اختیار کی۔ اس میں
بھی سرکار مظلوم کربلا سے تاثیر عطا ہوئی۔ جا بجا شہروں میں پڑھنے کی
نوبت آئی۔ رئیسان والا مقام نے مقبول فرمایا۔ ہر خاص و عام رئیسان
ذوی الاحتشام عزت بڑھاتے ہیں، ان دونوں میں وحید فرماتے ہیں۔

قمر کے بڑبولے پن، اور زیب داستاں کے لیے تھوڑے سے مبالغے اور تضاد کو نظرانداز کر دیا جائے تو بھی مندرجہ بالا اقتباس سے جو تصویر سامنے آتی ہے وہ لکھنؤ کے ایک پڑھے لکھے، باعزت گھرانے کے فرد کی ہے جس پر وہی کچھ بیتی جو لکھنؤ کے اکثر ہندو مسلمان شرفا پر اس زمانے میں گزری تھی۔ مندرجہ بالا بیان میں قمر نے لکھا ہے کہ اس وقت بھی (یعنی ''طلسم ہوش ربا''، جلد ششم، کی تصنیف و اشاعت، ۱۸۹۲/۱۸۹۳ء کے وقت) وہ نثاری اور داستان گوئی دونوں کام کرتے ہیں۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم، حصۂ دوم، (نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۳۱) کے صفحہ ۶۲۸ پر قمر کہتے ہیں:

شیوۂ نثر خوانی اس قدر کمتر ہے کہ صاحبان تصنیف اتنے بڑے شہر لکھنؤ
میں دو صاحب ہیں، تیسرا یہ حقیر اس زمرے میں درج ہوا۔ ...... جب
سے نثر شروع کی، بیان کرنا داستان کا بہت شاق ہوتا ہے۔ مجبور ہوں کہ
اس فن خاص داستان سرائی میں رئیسان عظام طلب فرماتے ہیں۔ ترک
مناسب نہ جان کر یہ مجبوری اختیار کیا۔

منقولہ بالا عبارت سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ قمر کی نگاہ میں داستان گوئی کا درجہ نثاری سے فروتر تھا۔ یا ممکن ہے یہ صرف ایک طریقہ ہو یہ اشارہ کرنے کا کہ وہ خود کو نثار اور مداح اہل بیت سمجھتے ہیں، اور ان کا بس چلتا تو داستان گوئی ترک کر دیتے۔ بالفاظ دیگر، قمر ہمیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ وہ پیشہ ور داستان گویوں سے کئی مدارج بلند شے ہیں۔ اسی لے میں ان کا یہ دعویٰ

Scanned by CamScanner

بھی ہے کہ وہ ''مؤرخ'' ہیں۔ ''بقیۂ طلسم ہوش ربا''، جلد اول (نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۱۱) کے صفحہ ۶۸۴ سے ایک کردار کی زبان سے انہوں نے کہلایا ہے:

> ہلال سحر افگن نے کہا، ''بوا، ایسے ہزار معرکے گزرے۔ قمر صاحب نے جو جلدیں لکھی ہیں ان کو ملاحظہ کرو۔ ایسا مؤرخ کوئی نہیں گزرا، خود مصنف ہیں۔''

احمد حسین قمر کی اولادوں میں اشتیاق حسین سہیل کے نام سے ہم واقف ہیں۔ بظاہر وہ داستان گو نہ تھے، لیکن شعر کہتے تھے، صرف تخلص کے گنہ گار نہ تھے۔ قمر کی کم سے کم ایک بیٹی بھی تھیں۔ ان کے شوہر، یعنی قمر کے داماد نادر مرزا عرف نواب دلہا کی ایک تقریظ ''طلسم ہوش ربا''، جلد ہفتم، کے آخر میں (ص ۱۰۷۵) درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نادر مرزا کو داستان گوئی بطور پیشہ اختیار کرنے کا شوق تھا، لیکن ''عارضۂ فیل پا میں مبتلا ہو کر مجبور و لاچار'' ہو کر کام ترک کرنا پڑا، ''ورنہ [بیماری سے پہلے] تاثیر نگاہ کیمیا خاصیت جناب سے بڑے بڑے جلسوں میں'' داستان سنانے کا اتفاق انہیں ہو چکا تھا۔

اوپر میں نے قمر کے بڑبولے پن کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود بینی کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں کینہ بھی بہت تھا۔ ہم محمد حسین جاہ کو دیکھتے ہیں کہ وہ معاصرین اور بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کرنے میں کمی نہیں کرتے، لیکن قمر نے جابجا اپنے معاصروں کی برائی کی ہے، اور عموماً بہت اوچھے اور بے صبرے انداز میں، گویا انہیں عدم تحفظ کا شدید احساس ہو اور انہیں فکر ہو کہ میں اپنی تعریف خود ہی کر لوں، شاید کوئی دوسرا تعریف کرے کہ نہ کرے، یا شاید اس دریا دلی اور جوش سے نہ کرے جس کا میں متمنی اور مستحق ہوں۔ اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ بالکل بے موقع وہ خود کو داستان گوئی اور نثاری میں ''وحید'' بتا رہے ہیں۔ معاصرین کے بارے میں کبھی کوئی اچھا لفظ ان کی زبان سے نہیں نکلتا۔ بزرگوں میں میر احمد علی کے بارے میں دنیا جانتی تھی (اور آج بھی داستان کے طالب علم واقف ہیں) کہ طلسم ہوش ربا دراصل ان کی تصنیف، یا تخلیق، تھا، اس معنی میں میر احمد علی سے پہلے اس داستان کو کسی نے بیان نہیں کیا۔ لیکن احمد حسین قمر ان کو

Scanned by CamScanner

بھی کوئی رتبہ دینے کو تیار نہیں، بلکہ انہیں بالکل بے حقیقت بتانا چاہتے ہیں۔

"طلسم ہوش ربا"، جلد پنجم، حصۂ دوم (نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۸۹۲) کے صفحہ ۴ پر احمد حسین قمر لکھتے ہیں کہ منشی نول کشور نے ان سے کہا:

تعجب کا مقام ہے کہ آپ ایسا کامل و اکمل داستان گو، وحید عصر شاعر و نثار، ہر فن میں ذی وقار، لکھنؤ میں موجود ہے۔ افسوس ہم کو قبل خبر نہ ہوئی ..... اگر قبل آپ سے نیاز ہوتا تو یہ چار جلدیں جو طبع ہوئی ہیں، آپ ہی سے ان کا ترجمہ کراتے اور لکھواتے ..... دفتر ہوش ربا آپ ہی کی سحر بیانی سے مشہور عالم ہوا، ورنہ کوئی اس کے نام سے بھی آگاہ نہ تھا۔

میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں کہ ایک اور مثال ملاحظہ ہو۔ "طلسم ہوش ربا"، جلد پنجم، حصۂ دوم (نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۱) کے صفحات ۶۲۷-۶۲۸ پر ارشاد ہوتا ہے:

ابھی تک کسی مقام پر قواعد طلسم ہوش ربا نہیں تحریر کئے۔ جب خیال آتا ہے قلب اس حقیر کا تھراتا ہے ..... جو صاحب اس کے مصنف مشہور ہیں، جناب میر احمد علی صاحب مرحوم و مغفور، انہوں نے چند اجزا تحریر فرمائے۔ وہ پردۂ کتمان میں تھے۔ جب حقیر نے ان اجزا کو پایا، داستان ہائے لطیف و عیاری ہائے ظریف جا بجا بڑھائیں، قواعد درج کئے ..... داستان جہانگیر اپنی ذات سے تصنیف کر کے شامل طلسم ہوش ربا کی۔ محرر ہر چار جلد نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ ..... بہت سی داستانیں اصل طلسم ہوش ربا کی نہیں ہیں۔ مجھ کو دستیاب ہوئیں، میں نے تحریر کیں ..... یہ ان کے قلم سے نہیں معلوم کس وجہ سے نہ نکلا، یا تعصب نے تحریر کرنے نہ دیا کہ یہ کل داستانیں تصنیف کردۂ منشی احمد حسین صاحب قمر ہیں۔ حقیر کو داستان گوئی پر ناز نہیں ..... بہ انقلاب فلکی اس امر کو اختیار کیا۔

Scanned by CamScanner

ہم دیکھ سکتے ہیں کہ محمد حسین جاہ تو اپنے معاصرین کو ''بڑا داستان گو''، ''میرے دوست، نامی داستان گو'' کہہ کر پکارتے ہیں، اور قمر کو میر احمد علی جیسے قدیم اور بڑے داستان گو کی بھی شرکت اپنی تصنیف میں گوارا نہیں۔ جاہ کا تو نام بھی نہیں لیتے، انہیں ہر جگہ ''محرر'' کہتے ہیں۔ تنگ جبینی اس سے زیادہ کیا ہوگی۔ (ممکن ہے کہ جاہ ان کے شاگرد رہے ہوں اور پھر برگشتہ ہو گئے ہوں، یا جاہ نے کسی ذاتی خفگی کے باعث قمر کی ہنسی اڑائی ہو، لیکن وہ سب پرانی باتیں اور معاصرانہ چشمکوں کے عام طریقے کی تھیں۔) دوسری بات یہ کہ وہ جاہ پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں کہ جاہ نے پورے طلسم ہوش ربا، یا اس کے بہت عمدہ مناظر اور وقوعوں کی ''تصنیف'' کا سہرا اپنے سر باندھ لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جاہ نے ایسا کہیں بھی نہیں لکھا۔ اس کے علی الرغم، مندرجہ بالا اقتباس میں قمر نے داستان جہانگیر کی ایجاد کا تمغا اپنے گلے میں لٹکا لیا ہے، حالانکہ جاہ نے صاف لکھا ہے (جیسا کہ اوپر مذکور ہوا) کہ یہ داستان شیخ تصدق حسین کی اختراع ہے اور سارا شہر اسے شیخ تصدق حسین سے سن چکا ہے۔ یہ ادائیں تو قمر کی ہیں کہ وہ شیخ تصدق حسین کیا، میر احمد علی تک کو بے دخل کر دینے کے درپے ہیں۔ جاہ پر کتمان حق کا الزام سراسر کینہ توزی ہے۔ پھر، دروغ گو را حافظہ نہ باشد کے مصداق وہ داستان جہانگیر اور چند خاص الخاص داستانوں کی ''تصنیف'' کے دعوے سے بڑھ کر ''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم، حصۂ دوم کے فوراً بعد جلد ششم میں یہ بھی کہہ بیٹھتے ہیں کہ یہ طلسم ''سراپا'' (یعنی تمام وکمال) ان کا تصنیف کردہ ہے۔

''طلسم ہوش ربا''، جلد ششم، (نول کشور پریس، کانپور، ۱۸۹۳) میں صفحہ ۱۱۷-۱۱۸ پر میر احمد علی اور جاہ دونوں کو سمیٹ کر احمد حسین قمر یوں گوہر افشانی کرتے ہیں:

> واضح رائے ناظرین ہو کہ یہ حجرۂ ہفت بلا خاص ترتیب کردۂ حقیر ہے۔ مصنف اول کو اس میں بالکل واقفیت نہیں ...... اس حقیر نے حجرۂ ہفت بلا کو اس طور سے ترتیب کیا کہ ایک ایک داستان اس کی فخر طلسم ہوش ربا ہے ...... دوسرا امر بھی واضح ہو کہ جناب میر احمد علی صاحب مرحوم نے طلسم ظاہر کر زور دیا۔ جب طلسم کشا کو لوح ملی، وہ کیفیت باقی نہ رہی۔

Scanned by CamScanner

......جلد ہفتم میں بعد حصول لوح ذہانت و عدم ذہانت ظاہر ہو جائے گی۔

محرر ہر چہار جلد [یعنی محمد حسین جاہ] اگر طلسم باطن لکھے گا، دفتر اصلی کا نمونہ ہو گا۔ حقیر نے سراپا تصنیف کر کے نام تو البتہ طلسم ہوش ربا رہنے دیا، مگر کل داستان ہائے رنگین و فصاحت آئین کو تازہ کیا۔ سامعین بلند مقام و شاہزادگان ذوی الاحتشام سالہا سال سے زبان سے حقیر کی بخوبی سماعت فرما چکے ہیں۔

اس سے پہلے، لیکن اسی جلد میں، احمد حسین قمر اپنے حسن بیان کے علاوہ دراکی ذہن کے ثبوت میں عجب دلچسپ بات کہہ چکے ہیں (ص۱۵۳):

رائے بیضائے ناظرین والا تمکین پر واضح ہو کہ یہ داستان شوکت بیان عجب طرح کے پیچ سے واقع ہوئی تھی، مگر حقیر پر تقصیر نے گنجلک اس کی نکالی، مضمون جلالت مشحون کو مثل آئینہ صاف و شفاف کیا۔

یہاں بے ساختہ سرسید کی عبارت یاد آتی ہے جو انہوں نے دہلی کے باکمال اہلِ فلسفہ کے لیے ''آثار الصنادید'' کے پہلے ایڈیشن میں لکھی تھی کہ ان حضرات کی طبع رسا ناخن عقل سے جزو لا یتجزیٰ کو دونیم کر دیتی ہے۔ قمر صاحب اپنے بارے میں کچھ ایسا ہی دعویٰ کر رہے ہیں۔ اپنی تعریف کی دھن میں وہ اٹھلا اٹھلا کر، چبا چبا کر گفتگو کرتے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ لوگ محظوظ بھی ہوں گے اور آمنا و صدقنا بھی کہیں گے۔ ایک مثال اوپر گزر چکی ہے جہاں وہ داستان کے ایک معمولی کردار کی زبان سے خود کو ''مؤرخ'' کا خطاب دلواتے ہیں۔ اب یہاں دیکھیے وہ افراسیاب بچارے کو نخاس یا چوک کا کوئی نیم خواندہ دوکان دار بنائے دیتے ہیں کہ کسی طرح تو اپنی ثنا کے پہلو نکلیں۔ ''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم، حصۂ دوم کے صفحہ ۸٦ پر ہے:

افراسیاب نے حرفوں پر نگاہ ڈالی، کہا: ''اری زبان دراز، دیکھ تو کیا لکھا ہے۔ سیاہی حروف دیکھ کر میری آنکھوں میں اندھیرا آ گیا ہے۔ ارے عربی فارسی پڑھنے والوں کو لاؤ۔ اس میں عربی لکھا ہے، جلد ترجمہ کراؤ۔

Scanned by CamScanner

اس تحریر پر پیچ کو مترجم صاحب سمجھیں گے۔منشی احمد حسین قمر کو بلاؤ، وہ ترجمہ بہت صاف کریں گے۔ میں نے عبارت ان کی دیکھی ہے۔ زبان صاف و شفاف، ہر طفل و جوان، خواندہ ناخواندہ، خاص عام نے ان کی زبان کو پسند کیا ہے۔ رؤسا نے شہنشاہ سخنوراں کا خطاب دیا ہے۔

ممکن ہے یہ ظریفانہ تحریر لکھنے کی کوشش ہو، لیکن ''اس تحریر پر پیچ'' سے جو عبارت شروع ہوتی ہے وہ ظریفانہ نہیں، نچلے درجے کی تعلّی و مباہات ہے۔ ''طلسم نوخیز جمشیدی''، جلد سوم (نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۰۲) کے صفحہ ۱۰۱۹ پر اپنے مرحوم باپ کے بارے میں اشتیاق حسین سہیل لکھتے ہیں کہ قمر کی ''طبیعت کی روانی دیکھنے بلکہ سننے میں بھی نہیں آئی۔'' اغلب ہے کہ یہ روانی انہیں تحریر میں بے اعتدالی کی طرف بھی لئے چلی جاتی ہو۔

احمد حسین قمر نے کیا عمر پائی، اس کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں۔ گمان غالب ہے کہ وہ محمد حسین جاہ سے عمر میں بڑے رہے ہوں۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، قمر نے ۱۸۵۷ کے زمانے میں خود کو صغیر سن لکھا ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ ۱۸۴۵ کے آس پاس پیدا ہوئے ہوں گے۔ شیخ تصدق حسین نے ''بالا باختر'' (نول کشور پریس، کانپور، ۱۹۰۰) کے صفحہ ۳ پر انہیں ''مدظلہٗ'' لکھا ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ جاہ اور شیخ تصدق حسین دونوں ان سے چھوٹے رہے ہوں گے۔

مندرجہ بالا معلومات کے ساتھ احمد حسین قمر کے بارے میں ہماری اطلاعات کا ذخیرہ ختم ہوتا ہے۔ مشہور محقق مرزا کاظم علی خاں کا کچھ نسبی رشتہ احمد حسین قمر سے ہے۔ میری درخواست پر انہوں نے خاندان کے بڑے بوڑھوں سے قمر یا ان کے اخلاف کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

شیخ تصدق حسین

(انتقال، مابین ۱۹۱۱ء و ۱۹۱۷)

یہ وضاحت اب شاید بہت ضروری نہ ہو کہ شیخ تصدق حسین داستان گو، اور سید تصدق

Scanned by CamScanner

حسین، مصحح مطبع نول کشور و صاحب ''لغات کشوری'' دو الگ الگ شخصیتیں ہیں۔ لیکن سید تصدق حسین کا بھی تھوڑا سا تعلق ذکر داستان گویاں سے ہے۔ سید تصدق حسین نے عبداللہ بلگرامی کی یک جلدی داستان امیر حمزہ کے ۱۸۸۷ ایڈیشن کے مصحح کی حیثیت سے اس پر نظر ثانی کی تھی۔ اس داستان کی اول اشاعت ۱۸۷۱ء میں ہوئی تھی، اور جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں، یہ دراصل غالب لکھنوی کے ترجمۂ ہزار داستان امیر حمزہ، مطبوعہ کولکتہ، ۱۸۵۵ء کی تقریباً ہوبہو نقل ہے۔ بہرحال، ۱۸۸۷ء کا ایڈیشن میرے پیش نظر نہیں ہے لہٰذا یہ بات طے کرنا میرے لیے اب مشکل ہے کہ تصحیح کے نام پر سید تصدق حسین نے داستان کی عبارت میں کیا تبدیلیاں کیں۔ اس داستان کے جدید ترین ایڈیشن (۱۹۶۹ء) میں مولانا عبدالباری آسی کی ''تصحیحات'' بھی شامل ہیں۔ مختلف نسخے جو میرے پاس ہیں، ان سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ غالب لکھنوی کا متن اب بھی کم وبیش قائم ہے۔ قطع برید بہت کم کی گئی ہے، اضافے کہیں کہیں ہیں، لیکن بہت معمولی حجم کے ہیں۔ میرا خیال ہے سید تصدق حسین نے اشعار بہت بڑھا دیئے تھے اور آسی نے انھیں برائے نام رہنے دیا۔ غالب لکھنوی کے اشعار بہت کم ہیں۔ اس طرح آسی کی ''تصحیحات'' نے بلگرامی کے متن کو غالب لکھنوی کے متن سے قریب تر کر دیا۔

گیان چند نے عشرت لکھنوی کے حوالے سے لکھا ہے (صفحہ ۲۳۷) کہ ''تصدق حسین جاہل تھے اور کاتبوں سے لکھواتے تھے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔'' گیان چند نے مسعود حسن رضوی ادیب کے قول کا ماخذ نہیں بتایا، اس لیے اس کے بارے میں کچھ کہنا ممکن نہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ شیخ تصدق حسین نقد بصارت سے تہی دست تھے۔ لیکن خود داستان میں جابجا تصدق حسین کے بارے میں ذکر اس امر کا ملتا ہے کہ وہ ''لکھتے'' تھے۔ ''تورج نامہ''، جلد اول (نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۰۶ء) میں صفحہ ۷۷۴ پر نواب دولہا عرف بنن صاحب المتخلص بہ کاشف کی تاریخ ہے۔ اس میں تصدق حسین کے بارے میں کہا گیا ہے ؎

قصہ گوئی میں ہیں وہ لاثانی
اور کرتے ہیں مرثیہ خوانی

خوش بیاں خوش اساس خوش تقریر

کھینچتے ہیں زبان سے تصویر

اس سے معلوم ہوا کہ تصدق حسین مرثیہ خواں بھی تھے اور زبانی لیاقت خوب رکھتے تھے۔ ان کے نابینا ہونے، یا اُمی ہونے، کا کوئی ذکر نہیں۔ اسی داستان میں اگلے صفحے پر خود شیخ تصدق حسین کی طرف سے ''التماس بخدمت ناظرین'' ہے۔ اس میں لکھا ہے:

> فن انشا پردازی مشکل ہے، اور میں ایک ہیچ مداں، کج مج زباں زلہ ربائے کاملین، خوشہ چین محققین قدیم، کم استعداد، کیا ہوں جو دعویٰ کروں ...... میں نے حسب الحکم منشی صاحب [پراگ نرائن بھارگو] جو کچھ برا بھلا ہو سکا قلم بند کیا۔

یہاں ایک بات تو سامنے کی ہے کہ شیخ تصدق حسین کہتے ہیں، میں نے ''قلم بند کیا۔'' اُمی ہونے یا بے بصارت ہونے کا کوئی اشارہ نہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ خود کو انشا پرداز کہتے ہیں، اور صاف صاف خود کو بزرگوں کا مقلد و متبع اور کاملین محققین کا خوشہ چین بتاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُمی ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا، کہ فوراً اس کی تردید کا امکان ہے۔ پھر اسی صفحے پر میرن صاحب آبرو لکھنوی کی تقریظ شروع ہوتی ہے جس میں ہم پڑھتے ہیں:

> جناب منشی تصدق حسین صاحب داستان سرا و مصائب خوان حضرت خامس آل عبا ہیں ...... علاوہ اس نسخہ کے اور بہت سی کتابیں تصنیف و تالیف کیں اور وہ مرغوب خاص و عام ہوئیں ...... [صفحہ ۷۷۶] اب دفتر لعل نامہ ...... مترجم صاحب اس کا ترجمہ فرما رہے ہیں ...... بعبارت سلیس اس دفتر کو تحریر کر رہے ہیں۔

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تصدق حسین کو مرثیہ خوانی کے علاوہ نثاری میں بھی درک تھا۔ (یا ممکن ہے کہ آبرو لکھنوی نے ان کی مرثیہ خوانی ہی کو مصائب خوانی خامس آل عبا کہہ دیا ہو۔ بہرحال یہ ثابت ہے کہ آبرو لکھنوی کے خیال میں شیخ تصدق حسین صاحب تصنیف و

Scanned by CamScanner

تالیف تھے۔ اور پھر آبرو لکھنوی نے بھی تصدق حسین کے لیے ''تحریر کر رہے ہیں'' کا فقرہ استعمال کیا ہے۔ لہٰذا ان کے اُمی یا / اور نابینا ہونے کا امکان کالمعدوم ہو جاتا ہے۔

''بالا باختر'' میں شیخ تصدق حسین نے اپنا کچھ تعارف لکھا ہے اور وہاں ایک بات ایسی لکھی ہے جو یہاں ذکر کے لائق ہے۔ اور عبارت ایسی ہے کہ ذرا مفصل اقتباس کا تقاضا کرتی ہے۔ صفحہ ۳ (مطبوعہ نول کشور پریس، کانپور، ۱۹۰۰ء) پر لکھا ہے:

> سرگشتۂ محاوی [وادی؟] جہالت و بے خودی، نابلد کوچۂ براعت و بخردی، خوشہ چین خوان بزم اہل کمال، زلہ ربائے بساط ارباب جاہ و جلال، اذل کونین شیخ تصدق حسین داستان گو خدمت ناظرین با تمکین میں بصد ادب ملتمس ہے کہ اس حقیر پر تقصیر کو ابتدائے سن شعور سے داستان گوئی کا شوق تھا اور ماہرین اس فن کی خدمت گزاری میں بسر کرتا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ کم مائیگی اور عدم لیاقت علمی سد راہ تھی، تاہم امرا و رؤسا و دیگر صنادید شہر نے اپنی عالی ہمتی سے اس کج زبان کے بیان کو پسند فرمایا۔ اور بموجب المرء یقیس علیٰ نفسہٖ اچھے لوگ بھی اس رد خلائق کو اچھا سمجھنے لگے ...... کمترین کو مثل بعض حضرات ستودہ صفات کے اپنی رطب اللسانی اور خوش بیانی کا دعویٰ نہیں ......

یہاں کئی باتیں توجہ طلب ہیں۔ اپنے بارے میں شیخ تصدق حسین کا یہ کہنا کہ علمی کم مائیگی اور عدم استعداد ان کی داستان گوئی میں سد راہ تھی، محض رسمی بیان ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لیے وہ معرب و ثقیل زبان لکھتے ہیں اور عربی کی ایک کہاوت بھی ڈال دیتے ہیں (انسان دوسروں کو خود پر قیاس کرتا ہے، یا بقول غالب ع اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا)۔ دوسری بات یہ کہ داستان گوئی جہلا کا فن نہیں ہے۔ اس کے لیے ''لیاقت علمی'' ضروری ہے۔ شیخ تصدق حسین کا یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ وہ داستان گوئی کے مزاج شناس تھے اور اس فن کے بارے میں ان کی رائے وہی تھی جو قدیم ماہرین فن کی تھی، اور جس کا تفصیلی تذکرہ ہم اس کتاب کی جلد اول

Scanned by CamScanner

میں پڑھ چکے ہیں۔ تیسری بات یہ کہ تصدق حسین کو بھی احمد حسین قمر کی عادت خود ستائی اچھی نہیں لگتی اور وہ ان پر ہلکی سی چوٹ بھی کر دیتے ہیں (''کم ترین کو...... دعویٰ نہیں'')۔ چوتھی بات یہ کہ آگے چل کر اسی عبارت میں انہوں نے احمد حسین قمر کو ''مدظلہٗ'' کہا ہے۔ لہٰذا وہ عمر میں قمر سے چھوٹے تھے۔

''گلستان باختر''، جلد سوم (مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۱۷ء) کے اندرونی سرورق پر حسب ذیل عبارت درج ہے:

> غرض ہر طرح سے یہ [دفتر] مصنف مرحوم کی آخری یادگار ہے۔ امید ہے کہ حضرات ناظرین اس سے محظوظ ہو کر ان مرحوم کو دعائے خیر سے یاد فرمائیں گے۔ اور بقیہ کتابیں ان کی تصنیف کردہ جو ابھی طبع نہیں ہوئی ہیں، وہ بھی خدا نے چاہا تو عنقریب چھپ کر شائع ہوں گی۔

یہ بات الجھن پیدا کرتی ہے کہ وہ ''بقیہ کتابیں'' شیخ تصدق حسین کی زندگی میں کیوں نہ چھپ سکیں، اور اس سے بڑھ کر الجھن میں ڈالنے کی بات یہ ہے کہ ۱۹۰۹ء میں ''گلستان باختر'' کی اول دو جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ پھر یہ تیسری جلد کیوں نہ چھپی، اور جب چھپی تو اتنی مدت بعد کیوں؟ اس غیر مطبوعہ جلد کا، اور ان دوسری ''تصنیفات'' کا، جو چھپیں نہیں، کوئی معاوضہ شیخ تصدق حسین یا ان کے ورثا کو ملا کہ نہیں، اس کے بارے میں بھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ فی الحال گیان چند (بحوالۂ امیر حسن نورانی) یہی کہا جا سکتا ہے کہ تصدق حسین کی دو داستانیں غیر مطبوعہ رہیں، ایک تو ''داستان چرخ گرداں'' جو ایک ہزار صفحات کی ہے، اور دوسری تین جلدوں اور دو ہزار صفحات پر محیط ''انیس دلربا''۔ یہ مؤخر الذکر داستان اپنی جگہ پر الگ ہے، اس کا تعلق داستان امیر حمزہ سے نہیں۔

''گلستان باختر'' کی اول دو جلدیں ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئیں۔ گمان غالب ہے کہ تیسری جلد بھی اس وقت تیار ہو گی۔ اس تیسری جلد کے بعد ہم شیخ تصدق حسین کی کسی تحریر کا ذکر نہیں سنتے۔ لہٰذا یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شیخ تصدق حسین کا انتقال ۱۹۰۹ء ہی میں ہو گیا اور ان

Scanned by CamScanner

کے مرجانے کے باعث ارباب مطبع کی توجہ ان کی طرف سے ہٹ گئی، حتیٰ کہ ''گلستان باختر'' کی تکمیل شدہ جلد سوم کو بھی انہوں نے سردخانے میں ڈال دیا۔ پھر کبھی بعد میں انہیں خیال آیا ہوگا کہ لاؤ یہ تیسری جلد بھی چھاپ لیں، اور انہوں نے ۱۹۱۷ء میں اسے چھاپ لیا، حالانکہ داستان کی نئی جلدوں کی اشاعت ۱۹۰۹ء میں عملاً ختم ہو چکی تھی اور اس سال کے بعد جو بھی داستانیں چھپیں وہ پہلے کی مطبوعہ داستانوں کی جدید طباعتیں تھیں۔ یعنی داستان طویل کی اشاعت کا سلسلہ ۱۹۰۹ء میں ختم ہو گیا اور ''گلستان باختر'' کی جلد سوم کی اشاعت اتنی مدت بعد ۱۹۱۷ء میں کیوں ہوئی، اس کے بارے میں ہمیں کوئی اطلاع نہیں۔ جلد سوم کے بارے میں ارباب مطبع کا یہ کہنا کہ ''ہر طرح سے یہ [دفتر] مصنف مرحوم کی آخری یادگار ہے، اس خیال کو تقویت دیتا ہے کہ شیخ تصدق حسین نے ۱۹۰۹ء ہی میں جلد سوم کو مکمل کر لیا تھا اور اس کے فوراً بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

یہ استدلال قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، لیکن نول کشور پریس لکھنؤ، کانپور اور لاہور کی وضاحتی فہرست برائے ۱۹۱۱ء میں شیخ تصدق حسین کا نام اس طرح لکھا گیا ہے کہ جس طرح زندوں کا نام لکھا جاتا ہے۔ مثلاً ''نوشیرواں نامہ'' کا اندراج وہاں حسب ذیل الفاظ میں ہے:

دفتر اول نوشیرواں نامہ۔ ترجمہ شیخ تصدق حسین

> صاحب داستان گوے قدیم سخن گوے شیریں مقال و بذلہ بے مثال جو اس فن کے نکتہ دان و دقیقہ شناس ہیں، انہوں نے اردو زبان میں ترجمہ کیا۔

یہاں صیغۂ حال کا استعمال بالکل صاف بتا رہا ہے کہ تصدق حسین ابھی بقید حیات ہیں۔ اس اندراج کے بعد اس فہرست میں شیخ تصدق حسین کو ''موصوف الصدر''، ''ممدوح الصدر''، ''مسبوق الذکر'' کہا گیا ہے۔ پھر ''گلستان باختر''، جلد سوم، کے بارے میں درج ہے کہ جلد دوم ''کے بعد تیسری جلد ہوگی جس میں کل داستانوں کا اختتام ہے، جو ابھی زیر طبع ہے۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''گلستان باختر''، سوم، کا مسودہ ۱۹۱۱ء میں زیر طبع تھا، یا ہونے والا تھا، اور اس وقت تصدق حسین بھی زندہ تھے۔ لہٰذا گمان یہ گزرتا ہے کہ ارباب مطبع نے کسی بنا پر ''گلستان

Scanned by CamScanner

باختر''، سوم کی اشاعت روک دی تھی اور پھر تلافی مافات کے طور پر اسے ۱۹۱۷ء میں شیخ تصدق حسین کی موت کے بعد شائع کیا۔ اس سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ شیخ تصدق حسین کا انتقال ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان ہوا۔

محمد حسین جاہ شاید احمد حسین قمر کے شاگرد تھے، یا شاید ''بڑے منشی''، منشی فدا علی کے۔ یا شاید ان میں سے کسی کے شاگرد نہ تھے۔ قمر کے سلسلے میں کسی استاد کا نام نہیں آتا۔ خود قمر کے الفاظ سے متبادر ہوتا ہے کہ وہ خود آموز تھے۔ شیخ تصدق حسین نے البتہ اپنے استاد میر اعظم کا ذکر کیا ہے (''آفتاب شجاعت''، جلد پنجم، حصہ دوم، نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۰۸ء، ص ۱۲۷)۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انہوں نے صرف اس لیے کیا ہے کہ استاد کا نام محفوظ ہو جائے، کیونکہ وقوعہ زیر بیان میں جو تبدیلی شیخ تصدق حسین نے اپنے استاد سے منسوب کی ہے وہ بہت غیر اہم اور معمولی ہے۔

گزشتہ جلد میں ہم اس مسئلے پر بحث کر چکے ہیں کہ ''آفتاب شجاعت'' (اور خاص کر اس کی جلد پنجم، حصہ اول) کی تالیف میں آرزو لکھنوی کا کوئی حصہ تھا کہ نہیں۔ وہاں اس بات پر بھی بحث ہے کہ جس طرح آرزو لکھنوی نے اپنا نام بیچ داستان میں ڈالا ہے، اور خود کو داستان گو بتایا ہے، اس سے کئی طرح کے سوالات اور امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں ایک امکان یہ بھی ہے کہ اگر شیخ تصدق حسین نابینا تھے، یا امی تھے، تو یہ بات قرین قیاس ہے کہ کسی نے (یا آرزو لکھنوی نے) شیخ تصدق حسین کی لاعلمی میں ایسا کچھ کھیل کھیل دیا ہو۔ یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ بوجہ پیرانہ سری یا علالت، شیخ تصدق حسین نے یہ داستان آرزو لکھنوی کو املا کرائی ہو اور مسودے کو خود نہ دیکھا ہو اور اس طرح آرزو لکھنوی کو مسودے میں تحریف و اضافہ کا موقع مل گیا ہو۔ ایک امکان یہ بھی ہے کہ ساری ہی داستان آرزو لکھنوی نے ایک طرح تصدق حسین کے لیے ٹھیکے پر لکھی ہو۔ اس بحث کو اس کتاب کی جلد اول کے صفحات ۳۶۴ تا ۳۶۹ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ اس بات کی کوئی شہادت نہیں کہ شیخ تصدق حسین پڑھے لکھے نہ تھے یا آنکھوں سے معذور تھے۔ اگر شہادت ہے تو اس بات کی ہے کہ وہ نہ حرف ناشناس تھے نہ امی۔ ''تورج نامہ''، جلد اول کی تقریظ مصنفہ میرن صاحب آبرو کا ذکر آ چکا ہے۔ اس تقریظ کے تقریباً آخر میں

Scanned by CamScanner

میرن صاحب آبرو کہتے ہیں (ص ۲۷۷) کہ شیخ تصدق حسین نے متعدد ''دفاتر'' مثلاً ''ایرج نامہ'' وغیرہ ''بڑی فکر سے تحریر کئے'' اور ''شکر ہے کہ مرغوب خاص و عام ہوئے''۔ پھر:

> ایک دن جناب ممدوح [شیخ تصدق حسین] نے مجھے یہ نسخہ [''تورج نامہ''] دکھایا، کچھ پڑھ کے بھی سنایا۔ مجھے بہت پسند آیا۔

اگر یہ بیان درست ہے (اور اس کے جھوٹ ہونے کی کوئی وجہ بظاہر نہیں) تو شیخ تصدق حسین کے بارے میں یہ روایتیں غلط ہیں کہ وہ ناخواندہ یا نابینا تھے۔

محمد اسمٰعیل اثر

ان کے بارے میں گیان چند نے اتنا ہی لکھا ہے کہ ''صندلی نامہ'' ان کی تصنیف ہے۔ اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ ایک ذرا سا امکان ہے کہ اسمٰعیل اثر نے محمد حسین جاہ کی شراکت میں جاہ کی ''طلسم ہوش ربا''، جلد پنجم، شائع کی ہو۔ طباعت اور اشاعت کی نگرانی اور انتظام کا تجربہ اسمٰعیل اثر کو تھا، اس بات کی شہادت ہمیں شیخ تصدق حسین سے ملتی ہے۔ ''تورج نامہ''، جلد اول (مطبوعہ ۱۹۰۶ء) کے صفحہ ۳-۴ پر شیخ تصدق حسین لکھتے ہیں کہ ''صندلی نامہ''، ''تورج نامہ''، اور ''لعل نامہ'' کی اشاعتیں ''بہ نگرانی و انتظام سخنور بے عدیل مولوی محمد اسمٰعیل صاحب متخلص بہ اثر اہلکار قدیم مطبع ''اودھ اخبار'' کو پہنچیں۔'' ارباب مطبع کا بیان ہے کہ ''آفتاب شجاعت''، جلد دوم کی ''ترتیب و تصحیح'' اسمٰعیل اثر نے کی۔ ''آفتاب شجاعت، جلد سوم کے سرورق پر درج ہے کہ اسے تصدق حسین نے ''بہ اعانت مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اثر'' لکھا۔ ''طلسم زعفران زار سلیمانی''، جلد اول (نول کشور پریس لکھنؤ، ۱۹۰۵ء) کے سرورق پر درج ہے کہ اس داستان کی ''تکمیل'' شیخ تصدق حسین نے ''بہ اعانت'' مولوی محمد اسمٰعیل اثر کی ہے۔ اسی جلد کے صفحہ ۹۱۶ پر درج ہے کہ اس داستان کو:

> منشی احمد حسین صاحب قمر مرحوم نے آغاز کیا تھا اور شیخ تصدق حسین صاحب داستان گو نے اختتام کو پہنچایا، اور مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اثر کارپرداز قدیم مطبع نے بہ عبارت شائستہ و طرز بائستہ ترتیب دیا۔

Scanned by CamScanner

اصطلاحوں کے اس وفور میں عقل حیران ہے۔ ''نگرانی و انتظام''؛ ''ترتیب و تصحیح''؛ ''اعانت''؛ ''ترتیب بہ عبارت شائستہ وطرز بائستہ''؛ ان میں کیا اور کتنا فرق ہے؟ مثلاً ''اعانت'' سے شراکت تصنیف مراد ہے، یا محض املا کے مطابق لکھنے کا مشینی عمل، یا حافظے کو برانگیخت کرنے اور ادھوری داستان کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے اشارے (اصطلاح میں ''بہتے'') فراہم کرنا مراد ہے؟ کچھ بات کھلتی نہیں، لیکن اس میں شک کی گنجائش بہت کم ہے کہ محمد اسمٰعیل اثر نے صرف ''صندلی نامہ'' نہیں لکھی، بلکہ وہ اور بھی کئی داستانوں کی ''ترتیب، تکمیل'' اور اشاعت میں سرگرم رہے۔

''صندلی نامہ'' کی دو اشاعتیں میرے پیش نظر ہیں۔ ایک تو اشاعت دوم (نول کشور پریس، لکھنؤ ۱۹۱۰ء)، اور دوسری چہارم (ایضاً، ۱۹۲۷ء)۔ دونوں میں داستان گو کا نام بالالتزام ''سید محمد اسمٰعیل'' لکھا ملتا ہے۔ جو اشاعت ۱۹۰۱ء کی ہے، اس میں ''سید محمد اسمٰعیل، متخلص بہ اثر'' لکھا ہے، اور ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں ''سید محمد اسمٰعیل المتخلص بہ اثر'' لکھا ہے۔ ایک خفیف سا شک گزرنا فطری ہے کہ ''سید محمد اسمٰعیل اثر'' داستان گو، اور ''مولوی محمد اسمٰعیل اثر'' دو الگ شخصیتیں تو نہیں؟ لیکن اس مفروضے کے لیے کوئی ثبوت کیا، کوئی کچی بنیاد بھی نہیں مل سکی ہے۔ لہٰذا فی الحال یہی کہنا چاہیے کہ ''سید محمد اسمٰعیل اثر'' اور ''مولوی محمد اسمٰعیل اثر'' ایک ہی شخص ہیں۔ ''تورج نامہ''، جلد دوم کے ۱۹۲۷ء ایڈیشن (نول کشور پریس، لکھنؤ) کے خاتمۃ الطبع میں صرف ''مولوی محمد اسمٰعیل'' لکھا ہے اور ساتھ میں مرحوم کا بھی لفظ ہے۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ تینوں ایک ہی شخص ہیں، یعنی سید محمد اسمٰعیل اثر، صاحب داستان ''صندلی نامہ''، بعض داستانوں کی اشاعت کے منتظم ونگراں ''مولوی محمد اسمٰعیل اثر''، اور ''مولوی محمد اسمٰعیل مرحوم'' ایک ہی شخص ہیں، اور یہ صاحب ۱۹۲۷ء کے پہلے راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔

پیارے مرزا

پیارے مرزا کے بارے میں گیان چند نے لکھا ہے (ص ۷۳۴-۷۳۵) کہ وہ ''مرزا محسن علی خاں عرف آغا جو ہندی کے شاگرد تھے اور انہوں نے شیخ تصدق حسین کی مدد سے ''تورج

Scanned by CamScanner

باصرہ کو جلد اول لکھی۔ ان کا خاص کام ''بوستان خیال'' کے لکھنوی ترجمے کی ترتیب ہے۔'' لیکن معاملہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ اول تو یہ کہ ''تورج نامہ''، جلد اول (مطبوعہ نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۰۱ء) کے سرورق، اور اس کے بعد پبلشر کے اشتہار (صفحہ ۷۷۶) پر لکھا ہے کہ اس داستان کے اصل ''مترجم'' پیارے مرزا ہیں اور یہ ترجمہ انہوں نے شیخ تصدق حسین کی ''اعانت'' (سرورق) اور ''استمداد'' (ص ۷۷۱) سے کیا ہے۔ لیکن خود شیخ تصدق حسین کا بیان اسی جلد کے صفحہ ۷۷۵ پر حسب ذیل ہے:

> کتاب لاجواب و نسخۂ انتخاب الموسوم بہ ''تورج نامہ'' ...... اس خاکسار، ذرۂ بے مقدار، اذل کونین، شیخ تصدق حسین نے موافق اپنی فکر تخیل کے تالیف کیا۔

یہاں ایک نئی اصطلاح ''تالیف'' نظر آتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ تصدق حسین اس جلد پر پیارے مرزا کے علی الرغم اپنا حق اور اپنا دعواے ملکیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہی بات میرن صاحب آبرو کی تقریظ سے بھی متبادر ہوتی ہے۔ اسی صفحے (۷۷۵) پر میرن صاحب آبرو کا قول ہے:

> سبحان اللہ اردو بھی کیا پیاری زبان ہے ..... گواہ اس تقریر کا ...... کتاب بے مثل ''تورج نامہ'' دفتر ہفتم داستان امیر حمزہ جس کے مترجم جناب شیخ تصدق حسین صاحب داستان سرا و مصائب خوان حضرت خامس آل عبا ہیں۔

''تورج نامہ''، جلد دوم کی ''تصنیف'' یا ''ترجمہ'' کے بارے میں بھی پیچیدگیاں ہیں۔ میرے پیش نظر ۱۹۲۷ء (مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ) کا ایڈیشن ہے۔ اس کے سرورق پر صاف لکھا ہے کہ اس داستان کو:

> شاعر شیریں زباں، ناثر خوش بیاں، منشی پیارے مرزا صاحب نے باعانت داستان گوے بے نظیر شیخ تصدق حسین صاحب، تصنیف کیا۔

Scanned by CamScanner

اب اسی جلد کا خاتمۃ الطبع ملاحظہ ہو (صفحہ ۱۳۸۸)۔ ارباب پریس کا بیان ہے کہ:

...... کتاب ''تورج نامہ'' جلد دوم ...... از تالیفات ...... شیخ تصدق حسین صاحب و بہ تصحیح و ترتیب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب مرحوم ...... زیور طبع سے آراستہ ہو کر ...... نور افزائے دیدۂ منتظراں ہوئی۔

یعنی سرورق پر پیارے مرزا اور ان کے معاون شیخ تصدق حسین، اندرونی صفحات پر صرف شیخ تصدق حسین، اور آخری صفحے پر شیخ تصدق حسین اور مولوی محمد اسمٰعیل۔ ناطقہ سر بہ گریباں نہ ہو تو کیا کرے؟ میں تو فی الحال اسی رائے کا ہوں کہ سرورق پر جو لکھا ہے وہ معتبر ہے، اور خاتمۃ الطبع میں اسمٰعیل اثر کا نام ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں شاید مصلحتاً بڑھایا گیا۔ لیکن یہ مصلحت کیا تھی، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ''تورج نامہ''، جلد دوم کی اول اشاعت میری دسترس میں نہیں، ورنہ یہ گتھی شاید کچھ سلجھ سکتی تھی۔

''تورج نامہ''، جلد دوم کے سرورق پر مہیا کردہ اطلاع کے بموجب پیارے مرزا شاعر بھی تھے۔ اور یہ بات کچھ بعید از قیاس نہیں۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ وہ فارسی کے شاعر رہے ہوں، کہ ان کے استاد آغا حجو ہندی کا کلام فارسی میں بکثرت ملتا ہے اور داستان میں بھی وافر مقدار میں درج کیا گیا ہے۔ اردو کے شاعر وہ شاید نہ تھے۔ ان کی فارسی ہندوستانی رنگ و مزاج کی، لیکن سلیس اور رواں ہے۔ لیکن اس کا بھی امکان ہے کہ پیارے مرزا نے آغا حجو ہندی کی شاگردی فن ترجمہ کے حصول کی غرض سے اختیار کی ہو۔ آغا حجو ہندی نے ''بوستان خیال'' کے لکھنوی ترجمے میں بہت کام کیا تھا۔

داستان امیر حمزہ کے داستان گویوں کے بارے میں ہماری موجودہ معلومات اتنی ہیں، بیدل نے سچ کہا

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

خدا ان لوگوں کے ساتھ فضل و جود و کرم کا معاملہ کرے، یہ ہمارے ادب کے بڑے لوگ ہیں۔

☆☆☆

Scanned by CamScanner